بلند اقبال۔۔ایک باصلاحیت افسانہ نگار

از۔۔نورالحسنین

اپنی طبعی عمر کا ایک طویل حصّہ اور اپنی ادبی عمر کا ایک بڑا چکر کاٹنے کے بعد میرے سامنے ایک ایسا نوجوان افسانہ نگار آیا جس نے وہ نہیں لکھا جو اُس کے ہمعصر لکھ رہے تھے اُس نے وہ بھی نہیں لکھا جو پہلے کے لوگ لکھ چکے تھے۔اُس نے وہ بھی نہیں لکھا جو سکہ بند ناقدین لکھوانا چاہتے ہیں۔وہ اپنی ابتدائی عمر ہی سے اپنی ایک سوچ رکھتا تھا اور اپنے فیصلے خود کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔چنانچہ جب اُس نے قلم اُٹھایا تو پورے اعتماد کے ساتھ اپنی بات لکھی اور اپنی فکر اور کرافٹ سے ایک نئی دنیا کو ڈھونڈھ نکالا،ایک ایسی نئی دنیا جو تھی تو ہمارے ہی اندر لیکن اتنی پوشیدہ تھی کہ اُس طرف دیکھنے کی کسی نے ہمت ہی نہیں کی۔سوال یہ ہے کہ آخر وہ کونسی دنیا تھی اور اُس کے کیا موضوعات تھے جس کے ہاتھ لگتے ہی بلند اقبال کو اتنی جلدی اعتبار اور امتیاز حاصل ہو گیا؟ سوچنے والے سوچتے رہ گئے کہ ابھی کچھ دن پہلے ہی کی بات ہے کہ یہ لڑکا یا بی بی سیدہ کے دعاؤں کی اُنگلی تھامے اپنے اطراف کی گمشدہ چیزوں کو تلاش رہا تھا، کسے خبر تھی کہ یہی تلاش اُسے اُس دروازے تک پہنچادے گی جو صرف کھل جاسم سم کا بہانہ ہوگی اور اُس کے سامنے وہ چہرے آجائیں گے جن کے باطن اُس سے سرگوشیاں کریں گے کہ ہم وہ ہیں جو اپنے آپ سے بھی سچے نہیں ہیں،ہم وہ ہیں جو اپنی عبادتوں میں بھی سچے نہیں،ہم خدا سے بھی آنکھ مچولی کھیلتے ہیں ہم اپنی ضروریات کی تکمیل کی خاطر برادرانِ یوسف سے بھی دو چار نہیں بے شمار قدم آگے ہیں۔ہمارے چہروں سے اُن مکھوٹوں کو اُتار پھینکو اور ہمارے اصلی چہرے واکردو۔خوب سمجھ لو اس دنیا کے مصلحت پسند اور مصنوعی اخلاقیات کا درس دینے والے ہماری طرف دیکھیں گے بھی نہیں بلکہ اپنے چہروں پر نقابیں اوڑھ کر آگے نکل جائیں گے۔یہ کام بلند اقبال تمھیں انجام دینا ہے۔سماج کے اس باطن سے آنکھیں چار کرنے کے باوجود اُس نے بے صبری کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ وہ نہایت ٹھہرے ہوئے انداز میں قدم اُٹھاتا رہا۔اُس نے ماڈل زرینہ کی طرف دیکھا تو اُس کی پشت پر استحصال کی صدیاں جوں کی توں اُسی طرح لدی ہوئی تھیں اور اُس نے لکھا:

> ”زرینہ کو کیا پتہ تھا کہ اچانک یہ ایک چھوٹا سا کڑا لمحہ صدیوں کی تاریخ خود میں سمیٹ کر اُسے زرینہ سے ذلیخا میں بدل دے گا۔اُس چھوٹے سے لمحے میں جب زرینہ اوروں کے لیے بے ہوش ہو کر ریمپ سے شائقین میں گری تھی،اُسی لمحے تو زرینہ،ذلیخا میں بدل کر بازار مصر پہنچ گئی تھی اور یوسف کا دامن پیچھے سے پکڑ کر چیخ رہی تھی کہ میں نے تمھارا دامن تو پیچھے سے پھاڑا تھا مگر تم تو نبی تھے نا! دیکھو تمھاری خود کی خاطر کی گئی جرح سے،میرا دامن ہمیشہ کے لیے پیچھے آگے دونوں ہی طرف سے پھٹ گیا ہے۔“
>
> (افسانہ۔پھٹا ہوا دامن)

اظہار کی یہ جرأت بازیچہ اطفال نہیں۔یہ وہ مقام ہے جہاں احتیاط کی حدیں حائل ہو کر تقدس کی چادریں تان دیتی ہیں لیکن

جن میں حوصلہ ہوتا ہے وہ تصویر کے پیچھے دیکھنے کی بھی جرأت کرتے ہیں اور یہیں سے ایک باغی افسانہ نگار طلوع ہوتا ہے اور اپنی کھلی آنکھوں سے اپنے اطراف دیکھتا ہے تو اُسے اکثر خدا کے نائب اُس کی ہی زمین پر اُس کے بخشی ہوئے تمام احکامات کی پابندیاں کرتے ہوئے بھی بشکل کارٹون ہی دکھائی دیتے ہیں:

'' تمھیں پتہ ہے بابا، محمد شجاع نے اپنے باپ کے کان میں سرگوشی کی، میرے اندر ایک کارٹون رہتا ہے۔ ہاں بابا ایک کارٹون، جیتا جاگتا کارٹون، ناچتا گاتا، اُچھلتا پھاندتا، منہ چڑانے والا کارٹون۔ بابا وہ کارٹون ہو بہو میری شکل کا ہے ۔میرے جیسا ناک نقشہ، میرے ہی جیسی ادائیں، وہ اچانک مجھ میں سے نمودار ہوتا ہے۔ تمھیں پتہ ہے بابا پہلی بار میں نے اُسے کب دیکھا تھا؟ میں مسجد سے نماز پڑھ کر نکل رہا تھا، میرے ہاتھوں میں تمہاری ہی دی ہوئی تسبیح تھی جس کے دانوں کو پڑھتا ہوا میں گھر آرہا تھا کہ اچانک یہ کارٹون مجھ میں سے نکل کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا اور پھر مجھے دیکھ کر زور زور سے تالیاں بجانے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے اُس کی دُم لمبی ہوگئی ہے اور شکل بندر جیسی اور پھر ایسے لگا جیسے کہہ رہا ہو کہ یہ ساری نمازیں پڑھ کر بھی تو مجھے بندر جیسا لگتا ہے۔ ہاں بابا یہ ٹھیک ہے میں ضرورتوں اور خواہشوں کا محتاج ہوں، میں بھی مصلحتوں کا مارا ہوا انسان ہوں، آسائشوں کا طلب گار ہوں، مجھ میں نمائش ہے، ظاہر داری ہے، میں غیبت بھی کرتا ہوں، رشوت بھی لیتا ہوں، اور جو وقت پڑے تو دوسروں کا مال بھی کھا جاتا ہوں مگر بابا پھر میں دن رات عبادتیں بھی تو کرتا ہوں اور ہاں بابا تمھیں پتہ ہے جب میں روز صبح قرآن شریف کی تلاوت کرتا ہوں تو یہ کمبخت کارٹون مجھ میں سے نکل کر کسی طوطے کی شکل میں ڈھل جاتا ہے اور پھر مجھ سے ٹرا ٹرا کر کہتا ہے تو کتاب پڑھ کر بھی طوطے جیسا لگتا ہے کیونکہ تو اسے طوطے ہی کی طرح تو پڑھتا ہے اور پھر وہ اپنی کریہہ آواز سے زور زور سے دہراتا ہے۔ تجھے معنی مطلب سے کیا مطلب؟ تجھے معنی مطلب سے کیا مطلب؟ اور بابا جب میں روزے رکھتا ہوں تو یہ کارٹون میرے پیٹ کا کیڑا بن جاتا ہے اور اندر سے میرے خالی پیٹ کو ڈھول کی طرح بجاتا ہے اور کہتا ہے جیسا دماغ ویسا پیٹ، بابا تم ہی کہو اگر میرے پڑوسی بھوکے سوتے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور، میں تو روزے کی پیاس جنت میں دودھ کی نہروں سے بجھانا چاہتا ہوں۔ بابا بتاؤ نا، آخر یہ کارٹون مجھ سے کیا چاہتا ہے۔''

(افسانہ۔۔کارٹون)

افسانے کا یہ اقتباس صرف آج کی نسل کا المیہ نہیں ہے۔ یہ تو صدیوں سے نسل در نسل اسی طرح جاری ہے۔ بلند اقبال کے حساس ذہن نے پھر ایک بار تین اور عمدہ افسانے جو اُس کی سوچ کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں اپنے قاری کو دیئے۔ جن کے عنوانات

''خدا کا بت، اُبال، اور شکوہ'' ہیں۔ ان افسانوں کے ذریعے اُس نے جو سوال اُٹھائے ہیں وہ یقیناً قاری خود سے بھی کرتا ہوگا لیکن خوف اور احتیاط کا دامن اُسکے ہاتھوں سے نہیں چھوٹتا۔ افسانہ'' خدا کا بت'' بظاہر ایک نہایت مختصر افسانہ ہے لیکن اس کی معنوی سطح لامحدود ہے ۔اس افسانے کا مرکزی کردار' آزر' وہ آزر نہیں ہے جس کا تعلق حضرت ابراہیمؑ سے تھا اور وہ خدا کے بت تراشتا تھا لیکن یہ موجودہ آزر وہ ہے جس نے کبھی مذہب سے کھلواڑ کیا، کبھی خدا کو ڈھونڈھنے کا دعویٰ کیا اور کبھی انسانیت کو اُس مقام تک پہنچا دیا جہاں انسان ہی نے انسان کا استحصال کیا۔ ذخیرہ اندوزی کی، عدم مساوات کی دیواریں کھڑی کر دیں، یہی وہ انسان ہے جس نے معصوم بچوں کے ہاتھوں میں کشکول تھما دیے جس کی تصویریں دنیا کے مختلف ممالک اور خصوصاً افریقہ کے بہت سارے ممالک میں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ افسانہ انسان کے خلاف انسان کا ایک شدید احتجاج ہے۔

افسانہ ''اُبال'' کے ذریعے بلند اقبال واضح کرتے ہیں کہ خوشحالی کے خواب اپنی مٹی کے گھروندوں سے اُٹھا کر ممالک غیر میں آباد تو کر دیتے ہیں لیکن مشترکہ خاندانوں کی تہذیب اور سچّے خلوص و پیار سے محروم کر دیتے ہیں۔

'' ہما بیٹی تسی امریکہ نہ جاو، امریکہ کہ پانی میں اخلاق تو بہت ہیں لیکن درد نہیں۔۔۔۔ درد جیسے کھانے میں نمک۔۔۔ ''

اس افسانے میں بلند اقبال نے ''دودھ'' کو زندگی کی اعلیٰ قدروں کی علامت کے طور پر باندھا ہے۔ غور کیا جائے تو یہ ایک بلیغ اشارہ ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ ہے کہ آپؐ کو دوران معراج تین پیالے پیش کیے گئے تھے۔ جن میں ایک پیالہ شراب کا تھا دوسرا پیالہ شہد کا اور تیسرے میں دودھ تھا۔ آپؐ نے دودھ کے پیالے کو پسند فرمایا تھا۔ اس واقعہ کی روشنی میں دودھ کی معنوی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ بلند اقبال کے اِس افسانے میں بھی دودھ اسی وسیع معنویت کو اُجاگر کرتا ہے۔ بلند اقبال اپنے اکثر افسانوں میں انبیاء علیہ السلام کی حیات اور عمل ہی سے اشارے، کنائے اور تشبیہات کو اخذ کرتے ہیں اور معنوی سطحوں کو بہت دور تک پہنچا دیتے ہیں۔

'' مجھے یاد ہے دودھ جیسے پاکیزہ رشتوں میں بندھا ہوا، اُس گھر میں بسا ہر ایک طلسماتی کردار۔۔۔ وہ قلم، جس کی نوک سے نکلتا ہوا ہر ایک لفظ زندگی کے انجان فلسفوں کو کورے کاغذ پر دھیمے دھیمے اُتارتا تھا۔۔۔ وہ جائے نماز جس پر سجدہ ریز ایک پیشانی، محبتوں کی علامت بنی اپنے خداوند سے اُس گھر کے مکینوں کی درازعمر کی دعائیں مانگتی تھی۔۔۔ وہ آہٹ، جو شام کے پچھلے پہر نانا نانی کے قدموں تلے سوکھے پتوں کے چرچرانے سے دالان میں پیدا ہوتی تھی۔۔۔ وہ سرسراہٹ، جو ماموں کے قلم کی نوک اور کاغذ کے بدن کے ملاپ سے لفظوں کی تخلیق کی شکل میں پیدا ہوتی تھی۔۔۔۔ وہ شدّت جو ممانی کی محبتوں کی وجہ سے اُس گھر کے ہر ایک رشتے، ہر ایک کردار کو پیار کے دھاگوں میں ایک توازن سے باندھ دیتی تھی۔''

(افسانہ۔۔اُبال)

افسانہ ''شکوہ'' بھی اپنے موضوع کے لحاظ سے نہایت اچھوتا افسانہ ہے۔ یہ ایک بوڑھے آرٹسٹ کا خالق کائینات سے تخلیق کائینات کا ایک شکوہ ہے۔ یہاں آرٹسٹ کسی فن پارے کو کس آسانی سے تشکیل دیتا ہے وہ ملاحظہ فرمائیں:

'' کچھ نہیں ، بس یونہی خیال آیا تھا اور برش کینوس پر چلتا گیا ۔ رنگ پر رنگ چڑھنے لگا اور خالی خولی لکیریں زندگی کا مزہ چکھنے لگی ۔ کچھ ہی دیر میں بے جان کینوس جیسے زندگی کا روپ پانے لگا ۔ ایک لکیر جو ترچھی پڑی تو اُجاڑ شاخوں پر پھول کھل گئے ، ایک لکیر جو آڑی پڑی تو انجان راستوں پر قدموں کے نشان بن گئے ۔ کہیں دہکتا ہوا سورج جلنے لگا اور کہیں چاند شرمانے لگا ۔ وقت بھی اپنے حصّے کا برش پھیر گیا اور کینوس صبح و شام کے رنگوں سے سجنے لگا ۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایسی تصویر بنی کہ خود برش بھی کینوس سے شرمانے لگا ۔''

(افسانہ۔۔شکوہ)

یہی تخلیق آرٹسٹ کے ذہن کے دریچوں کو وا کرتی ہے اور اُسے محسوس ہوتا ہے جیسے اُس کی یہ آڑی ترچھی لکیریں اُس سے پوچھ رہی ہیں ۔۔۔ کیوں تم نے ہمیں اپنے برش کے رنگوں سے کسی وجود کی شکل بخشی ہے ۔۔۔ یہ سورج ، یہ چاند ، یہ تارے ، یہ پھول ، یہ افق کی لالی ۔۔۔ یہ سارے رنگ تمہارے تصور میں بس کر ہی ہم بے نام لکیروں کو زندگی عطا کر گئے ہیں ۔۔ کس لیے ؟ کیا صرف اس لیے کے ہم بازار میں فروخت ہو سکیں ؟ بلند اقبال اپنے اس احتجاج کو اُس آرٹسٹ کے حوالے سے اپنے قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں:

'' اُس رات وہ سفید بالوں والا آرٹسٹ اپنی جائے نماز پر دیر تک روتا رہا اور کسی بلبلاتے ہوئے بچے کی طرح اپنے خداوند تعالیٰ سے گڑگڑا کر فریاد کرتا رہا ۔۔۔ کیوں ایسی بھی کیا ضرورت تھی ۔۔۔؟ تم نے ہمیں بے جان رنگوں سے ایک ہستی کی شکل دے دی ۔۔ تمھیں پتہ ہے نا ! تمہاری ان ہر ایک آڑی ترچھی لکیروں کے پیچھے بہت کرب ناک فسانے ہیں ۔ بھوک ، غربت ، بیماری ، افلاس اور لاچارگی کے صدیوں پرانے زمانے ہیں ۔۔ تمہاری تصویر کے رنگوں میں انسانی لہو سے بنے ہوئے آشیانے ہیں ۔ تمہارا برش جو رنگوں کی بہاریں لایا ہے ، وہ جو خیال کی صورت میں تم میں سمایا ہے ۔۔۔ اسے وہیں بسے رہنے دیتے ۔ ہمیں اپنی ہی ذات کا حصّہ بنے رہنے دیتے ۔ ہماری ہستی کی ایسی بھی کیا ضرورت تھی ۔ کیا محض اپنی ذات کو جاننے کے لیے ۔۔۔ ؟ کیا محض اپنی تخلیق کو ناپنے کے لیے ؟ تمھیں تو پتہ ہے نا ؟ ؟ میری تخلیق تو آرٹ گیلری میں محض ایک بار بکتی ہے اور تمہاری تخلیق یہاں دنیا میں بار بار ۔۔۔''

بلند اقبال کا یہ افسانہ پڑھتے ہوئے جانے کیوں سعادت حسن منٹو کا '' کتبہ '' یاد آجاتا ہے یا پھر علامہ اقبال کا شکوہ جواب شکوہ ۔ قاری کو چونکانے والے ایسے کئی افسانے بلند اقبال کے پاس ہیں ۔ انسان اپنی جوانی میں معاشرے سے ہر طرح کی بغاوت

کرتا ہے۔اعلیٰ اقدار کو اپنے پیروں تلے روندتا بھی ہے۔مذہب سے بغاوت بھی کرتا ہے جنسی خواہشات کی تکمیل کی خاطر معاشرتی، مذہبی، تہذیبی اُصولوں کا مذاق بھی اُڑاتا ہے۔ایک ہی وقت میں کئی کئی عورتوں سے تعلقات بھی قائیم کرتا ہے لیکن جب خود اپنی بیٹی کو دیکھتا ہے تو آزاد خیالی کے وہ سارے پربت پل بھر میں ڈھیر ہو جاتے ہیں اور آنے والا مستقبل خوف زدہ کر جاتا ہے۔بلند اقبال نے اسی خیال کو اپنے افسانے ''آدھا کافر'' میں پیش کیا ہے۔افسانہ'' بو'' بھی موضوع کے اعتبار سے ایک بالکل اچھوتا افسانہ ہے۔اس افسانے میں فیشن کے نام پر جانوروں کے بے جا قتل کو نشانہ بنایا گیا ہے۔

اسلام، دینِ فطرت ہے جو دنیا اور دینی معملات میں ایک توازن کی تعلیم دیتا ہے لیکن اکثر تعلیم یافتہ افراد بھی اسے کس طرح پیش کرتے ہیں اس کی مثال افسانہ'' سہاگ رات'' میں پیش کی گئی ہے۔عورت خواہ تعلیم یافتہ ہو یا غیر تعلیم یافتہ، مذہبی رنگ میں ڈوبی ہو یا حد درجہ ماڈرن وہ اپنے شریک حیات میں کسی قسم کی ساجھے داری قبول نہیں کرتی۔بلند اقبال نے اسی بات کو اپنے افسانے
'' نہیں'' میں اُجاگر کیا ہے۔اس کے برخلاف افسانہ'' بے وفائی'' اُن لوگوں کی کہانی ہے جو اپنے معمولی فائدے کی خاطر مذہب کا استحصال کرتے ہیں۔

بلند اقبال کے پاس رومانی افسانے بھی ہیں لیکن اُن کا مزاج عام رومانی افسانوں سے بہت مختلف ہے۔ان میں چند افسانوں میں ''وائٹ ہول، پہلا پیار،، رام محمد دہریہ، اور یہ کیسی بے وفائی ہے۔وغیرہ ہیں۔

بلند اقبال کا اسلوب نہایت رواں ہے۔وہ نہایت خوبصورت زبان لکھتا ہے ۔وہ تکنیک کے تجربوں سے زیادہ موضوع اور مواد پر زور دیتا ہے۔اپنے موضوع کو مختصر لیکن بھرپور تاثر کے ساتھ پیش کرنے کا فن اُسے خوب آتا ہے۔اس کی تحریر میں ایک ایسا رس ہے جو قاری کو باندھے رکھتا ہے۔چونکہ پیشے سے ڈاکٹر ہیں اس لیے اس کے افسانوں میں طبّی، سائینسی اصطلاحات پوری صحت کے ساتھ آتی ہیں۔وہ جہاں قاری کی معلومات میں اضافہ کرتی ہیں وہیں ایک نئی معنوی سطح بھی قائم کرتی ہیں۔

اس چھوٹے سے مضمون میں بلند اقبال کے تمام افسانوں کا جائزہ لینا بہت مشکل ہے۔میں نے پھر بھی کوشش کی کہ اُس کے کچھ نمائیندہ افسانوں پر گفتگو کر سکوں۔وہ ایک متنوع افسانہ نگار ہے اور اُس کے پاس اچھوتے موضوعات کی ایک کہکشاں بکھری ہوئی ہے اور کیوں نہ ہو وہ دنیائے ادب کے نہایت منفرد و ممتاز عبقری شاعر، حمایت علی شاعر کا فرزند ہے، ادب اور ادبی ماحول اُسے ورثے میں ملا ہے لیکن حیرت اس بات پ ہے کہ اپنے والد کی غیر معمولی شاعرانہ عظمت وشہرت کے باوجود اُس نے شاعری کے بجائے صنفِ افسانہ کو اپنے لیے پسند کیا اور اپنی ذاتی صلاحیتوں سے بہت جلد اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اپنے ایک تنقیدی مضمون میں میں نے لکھا تھا کہ وہ نسل جس نے بیسویں صدی کی نویں دہائی میں لکھنا شروع کیا ہے۔یہ تازہ دم پیڑھی قارئین اور ناقدین کو اپنے نام یاد کروانے میں تو کامیاب ہو گئی ہے لیکن اُن کے قلم سے ابھی وہ چمتکار سامنے نہیں آیا جس کی بنیاد پر اُن کی علحدہ سے کوئی خصوصیت ظاہر ہو سکے۔یہ پیڑھی ذہنی طور پر اردو کی پہلی اور بیسویں کی آٹھویں دہائی میں اُبھرنے والی نسل سے زیادہ

قریب ہے۔اُن کے موضوعات بھی وہی ہیں،تکنیک اوراسلوب کا میدان بھی وہی ہے،واقعہ کو برتنے اورسوچنے کا انداز بھی وہی ہے

اس تازہ کار افسانہ نگاروں کی نسل جسے اکیسویں صدی کی پہلی ادبی نسل ہونے کا شرف حاصل ہے،اسے فن کے میدان میں کوئی ایک ایسا نیا رُخ کھوجنا ہے جہاں سے اُن کی اپنی انفرادیت قائم ہو سکے۔اگر وہ اس طرف توجہ نہیں دیں گی تو محض مقلدین کی صف میں کھڑی رہ جائیں گی اوراُن کا حشر بھی وہی ہوگا جو کرشن چندراور سعادت حسن منٹو کے مقلدین کا ہوا تھا۔

میں بلند اقبال کا شمار بھی اکیسویں صدی کی پہلی نسل میں کرتا ہوں اور مجھے خوشی ہے کہ اُس نے بڑی حد تک اپنے فن میں موضوعی سطح پر اسلوب کے میدان میں اورزبان کے استعمال میں وہ چمتکار کر دکھایا ہے۔ جہاں سے انفرادیت کی راہیں کھلتی ہیں۔

مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی جھجھک نہیں ہوتی کہ بلند اقبال اس نئی نسل کا اولین مثالی،باصلاحیت افسانہ نگار ہے جو یقیناً اس میدان میں مزید نئے اُفق دریافت کرے گا۔

☆☆☆☆

Noorul Hasnain

1-12-31 Pragati colony

Ghati , Aurangabad

431001 (M. S) India